سید احمد خان کی فکر میں سیاسی جدیدیت

Political Modernity In the Thought of Sayyid Ahmad Khan

Dr Shahid Rasheed
Assistant Professor Department of Sociology
FC College University Lahore
Email: shahidrasheed@fccollege.edu.pk

ABSTRACT
This paper aims to understand and analyze Sayyid Ahmad Khan's responses to the modern political institutions introduced by the British and political milieu of Nineteenth century colonial India. Sayyid Ahmad Khan was a keen observer and witness of the end of the Mughal dynasty, East India Company's rule, Indian Revolt of 1857, Muslim persecution after 1857, and the formal beginning of the British Raj. All these political upheavals and revolutions influenced Sayyid Ahmad Khan's thought. He sought to understand the key to the British victory and the ground realities of India and Muslims of India. Sayyid Ahmad Khan, while agreeing with the tenets political modernity in the West, emphasizes that the peculiar situation of India must be considered for formulating any program of socio-political progress of India.
Keywords: Sir Sayyid, Political Modernity, Nationalism, Muslim India, South Asia, Democracy

برطانوی ہند کے پہلے سب سے بااثر مسلمان مفکر اور مصلح سید احمد خان (1817-1898) تھے۔ انھوں نے ایک روایتی مسلمان کے طور پر تربیت حاصل کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ یورپی طرزِ زندگی اور یورپی اداروں کی خوبیوں کے قائل ہوتے گئے۔ اردو اور فارسی کے نامور شاعر اسد اللہ غالب نے اُس وقت ہی جدیدیت کو سمجھنے کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا، جب سید احمد خان آئینِ اکبری کا ترجمہ کر رہے تھے۔ جب انھوں نے غالب سے پیش لفظ لکھنے کی درخواست کی تو غالب نے ان سے کہا کہ اگر وہ مغلیہ خاندان کے قوانین کی عظمت کو بیان کرنے کے بجائے برطانوی نظامِ حکومت کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو یہ زیادہ بہتر ہوتا[1]۔

سید احمد خان ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جدیدیت کی اہمیت کے بارے میں بخوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے جدیدیت کو علم، منطق، سائنس اور فطرت کے ساتھ وابستگی کے ایک منہج کے طور پر دیکھا۔ سید احمد خان جدیدیت اور مذہب دونوں کو بیک وقت اپنانا چاہتے تھے۔ اُن کے مطابق اسلام کی حقیقی روح اور جدیدیت کے درمیان کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے۔ لیکن ان کے بقول مسلمانوں کے موجودہ تصورات اور طریقوں کی اصلاح کی اشد ضرورت تھی ۔انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام جدیدیت سے ہم آہنگ ہے، ایک جدید علم الکلام شروع کیا۔ انھوں

نے ثابت کیا کہ قرآن کسی صورت قوانینِ فطرت سے متصادم نہیں ہو سکتا کیونکہ اول الذکر خدا کا کلام ہے جبکہ مؤخر الذکر خدا کا کام ہے۔ سر سید نے اس امر کی نشاندہی کی کہ جدید دور میں مذہب کا انسانی سماج میں کردار تبدیل ہو گیا ہے۔ پہلے مذہب معاشرے کے مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتا تھا لیکن دورِ حاضر میں یہ زیادہ تر معاشرے کے روحانی پہلوؤں تک محدود ہے[2]۔

جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو 1858ء سے 1870ء تک انگریزوں نے نشانہ بنائے رکھا۔ تاہم 1870ء میں پالیسی میں تبدیلی رونما ہوئی اور یہ تبدیلی بنیادی طور پر سید احمد خان کی انتھک کوششوں کی بدولت عمل میں آئی[3]۔ انھیں برطانوی حکومت اور مسلم ہندوستان کے درمیان مفاہمت کا پیامبر کہا جا سکتا ہے۔ اُن کی حکمت عملی کے دو پہلو تھے۔ اول، وہ برطانوی حکومت کو یقین دہانی کرانا چاہتے تھے کہ ہندوستانی مسلمان درحقیقت وفادار ہیں اور ان کی حالیہ بغاوت ان کے مؤقف کی صحیح عکاسی نہیں تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمان حکومت کے مقاصد کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے تھے۔ انھوں نے برطانوی حکومت کو بھی ایسے قوانین وضع کرنے پر تنقید کا نشانہ بنایا جو ہندوستانی تہذیب کی اخلاقی اقدار سے متصادم تھے۔ انھوں نے اپنے مؤقف کو 'اسبابِ بغاوتِ ہند' میں کافی منطقی انداز میں بیان کیا۔ دوم انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ برطانوی حکومت کو تسلیم کریں۔ انھوں نے ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کے اس دعویٰ کو سراسر بے بنیاد قرار دیا کہ برطانوی مسلمانوں پر ملکہ برطانیہ کے خلاف بغاوت کرنا ان کے مذہبی ایمان کی بنیاد پر واجب ہے۔ 'The Loyal Muhammadans of India' میں انھوں نے کہا کہ کوئی بھی برادری مسلمانوں سے زیادہ وفادار نہیں ہو سکتی کیونکہ مسلمان مسیحیوں کو اہلِ کتاب سمجھتے ہیں۔

سید احمد خان نے اسلام میں جہاد کے تصور پر وسیع تر تناظر میں روشنی ڈالی۔ انھوں نے مدلل انداز میں یہ بیان کیا کہ پیغمبرِ اسلام کی جانب سے لڑے گئے غزوات دفاعی نوعیت کے تھے اور یہ کہ اسلام میں غیر مسلموں کو اسلام قبول کرانے کے لیے تشدد کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ سید احمد خان پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے جنگِ آزادی (1857) کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے تاریخِ سرکشیِ بجنور، رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند اور رسالہ خیر خواہان مسلمانان لکھا۔ یہ تینوں رسائل 1857ء کے واقعات کی مجموعی تصویر کشی کرتے ہیں اور ہندوستانی رعایا کے ساتھ ساتھ برطانوی حکمرانوں کے افکار اور تخیل کی بنیادی ساخت کو بھی بیان کرتے ہیں۔ سید احمد خان نے اس بات پر بھی زور دیا کہ 1857ء کے واقعات کو جہاد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ زیرِ حفاظت لوگ اپنے محافظوں کے خلاف جہاد نہیں کر سکتے اور مسلمان ہندوستان میں انگریزوں کے زیرِ حفاظت

زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ یہ مؤقف مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے شاگردوں کے مؤقف کے برعکس تھا جنھوں نے شاملی اور تھانہ بھون کے محاذوں پر انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی تھی[4]۔

سید احمد خان نے دارالحرب / دارالاسلام کے بیانیے کے حوالے سے یہ تجویز پیش کی کہ تصویر کے دو رُخوں کے درمیان کوئی مصالحتی مؤقف بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندوستان صرف اس لحاظ سے دارالحرب ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں بھاری سود کے متعلق بعض قوانین میں نرمی کی گئی تھی۔ لیکن یہ اس لحاظ سے دارالحرب نہیں تھا کہ مسلمان انگریزوں کے خلاف جنگ کریں۔ اس کے برعکس مسلمان انگریزوں کی پُرامن رعایا کے طور پر مطیع رہنے کے پابند تھے۔ انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال دی جنھوں نے مصر کے ایک غیر مسلم بادشاہ کے ماتحت پُرامن طریقے سے اپنے انتظامی اور روزمرہ امور انجام دیے۔ ان کی رائے میں کوئی بھی چیز مسلمانوں کو کسی غیر مسلم سیاسی حکمران کے تحت کام کرنے سے منع نہیں کرتی۔

سید احمد خان کی رائے میں ہندوستان اور بالخصوص مسلم ہندوستان کا بنیادی مسئلہ برطانوی تسلط نہیں تھا جیسا کہ اُنیسویں صدی کے مفکرین اور مصلحین خیال کرتے تھے۔ بنیادی مسئلہ مسلم برادری کا ثقافتی، فکری اور اخلاقی زوال تھا۔ اسلام کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن مسئلہ مسلمانوں کے اسلام کو سمجھنے کا تھا۔ سید احمد خان کے نزدیک حقیقی اسلام یورپی اقوام کی تمام ثقافتی اور فکری ترقیوں سے ہم آہنگ تھا۔ مسلمان اپنے سنہری دور میں عصرِ حاضر کے یورپی باشندوں جیسی خصوصیات اور نقطہ نظر کے حامل تھے۔

دو بڑے واقعات نے سید احمد خان کے نقطہ نظر کو متاثر کیا۔ پہلا واقعہ جنگِ آزادی تھی اور دوسرا 1869ء میں ان کا دورہ انگلستان تھا۔ ڈبلیو۔ سی۔ اسمتھ کے مطابق سید احمد خان جو پہلے ہی مسلمانوں کو سیاسی طور پر انگریزوں کے وفادار رہنے پر زور دے رہے تھے، اس دورے کے بعد انگریزوں کی تعلیمی اور ثقافتی برتری کے قائل ہو گئے اور اپنی قوم کی حتمی کامیابی صرف یورپی ثقافت کو اپنانے میں سمجھی[5]۔ اس لیے انھوں نے 1870ء میں ہندوستان واپسی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی اصلاح کے لیے بھرپور مہم چلائی۔ انھوں نے قرآن کی عقلی تشریح پر زور دیتے ہوئے کہا کہ 'خدا کے کلام' (قرآن) اور 'خدا کے کام' (فطرت) میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اسلام کے بنیادی اصولوں اور استخراجی اصولوں میں فرق کو بھی بیان کیا۔ بنیادی اصول قرآن کی واضح اور قطعی آیات اور استخراجی اصول علماء اور فقہاء کی آراء ہیں۔

سید احمد خان نے واضح طور پر بیان کیا کہ اسلام ہر قسم کی مُلوکیت کی مخالفت کرتا ہے۔ انھوں نے اپنا نظریہ

خلافت پیش کیا جس کے مطابق پیغمبرِ اسلام کی ذات کے تین پہلو ہیں۔ سب سے پہلے، آپؐ وہ ہستی ہیں جن پر وحی الٰہی کا نزول ہوا۔ اس پہلو کے لحاظ سے کوئی آپؐ کا خلیفہ (نائب) نہیں ہو سکتا۔ دوم، آپؐ نے اُس کلام کو دوسرے لوگوں تک پہنچایا جو خدا تعالیٰ نے آپؐ پر نازل فرمایا۔ اس حوالے سے علمائے کرام جو عقیدے کی تعلیم دیتے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ (نائب) ہیں۔ آخری پہلو یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام سیاسی طبقے کے رہنما بھی تھے۔ اس لحاظ سے جو لوگ کسی ملک کے حکمران ہیں اور ایک پُرامن معاشرے کے قیام کے لیے قوانین نافذ کرتے ہیں انھیں رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ تصور کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسلام کی حقیقی روح کے ساتھ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں۔ اس لحاظ سے کسی ملک کا مسلمان حکمران خلیفہ ہو سکتا ہے لیکن وہ صرف اپنی مسلم رعایا کا خلیفہ ہو گا نہ کہ اس کے سیاسی دائرہ اختیار سے باہر رہنے والے مسلمانوں کا کیونکہ کسی ملک کا خلیفہ ہونے کے لیے اپنے ملک پر اختیار استعمال کرنے کا اہل ہونا ضروری ہے۔ یوں خلافت ایک سیاسی تصور ہے اور اس علاقے تک محدود ہے جس میں سیاسی اختیار استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سید احمد خان کے نزدیک خلافتِ عثمانیہ ایک باضابطہ خلافت ہو سکتی ہے لیکن صرف اپنی سیاسی حدود کے اندر۔ ہندوستان کے مسلمان خلافتِ عثمانیہ کے قانونی طور پر پابند نہیں ہو سکتے۔ اُن کی وفاداری صرف ہندوستان کے حکمرانوں کے لیے واجب ہے جن کی حفاظت میں وہ رہ رہے تھے۔ چونکہ برطانوی حکومت جو اگرچہ مسیحی مذہب کی پیروکار ہے، مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی اور ان کے لیے امن اور سلامتی اور اُن کی جان و مال کے تحفظ کو یقینی بناتی ہے، انھیں برطانوی ہندوستان کے وفادار شہری ہونا چاہیے اور خلافتِ عثمانیہ کے احکام کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ اگرچہ سید احمد خان سلطنتِ عثمانیہ کی ثقافت، سماجی اقدار اور جدیدیت کی وجہ سے سراہنے کے ساتھ ساتھ خلافتِ عثمانیہ کے خلیفہ کے لیے عمومی ہمدردی اور قدردانی کا جذبہ رکھتے ہیں، لیکن وہ انھیں ہندوستانی مسلمانوں سے براہِ راست بات چیت کرنے کا مجاز نہیں سمجھتے کیونکہ ہندوستانی مسلمان اُن کی رعایا نہیں تھے[6]۔

سید جمال الدین افغانی نے ایک پمفلٹ 'مادیت پسندوں کی تردید' میں سید احمد خان کے نظریات کو تنقید کا نشانہ بنایا[7]۔ ان کی زیادہ تر تنقید سید احمد خان کی مبینہ مادہ پرستی اور اسلامی خلافت کو مسترد کرنے اور غیر ملکی استبدادیت کو قبول کرنے پر مبنی ہے۔ سید جمال الدین افغانی کے اسلامی اتحاد کے نظریہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام مسلمان متحد ہو جائیں اور ایک خلیفہ کی قیادت میں اسلامی ریاست قائم کریں۔ وہ مسلم دنیا میں زبان اور ثقافت کے تنوع کے بارے میں بہت واضح ہیں۔ تاہم وہ مختلف مسلم ممالک کے درمیان تعاون پیدا کرنے پر زور دیتے ہیں تاکہ وہ مغربی تسلط سے آزادی حاصل کر سکیں۔ اُن کے خیال میں اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ حکمران بادشاہوں کے

خاندانی مفادات ہیں[8]۔ سید جمال الدین افغانی ایران اور افغانستان کو متحد ہونے اور ہندوستان کی انگریزوں سے آزادی میں معاونت کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اُن کے اِن خیالات نے ہندوستان کے بعض مسلم علماء اور دانشوروں کو یقیناً متاثر کیا۔ لہٰذا اُن کے اسلامی اتحاد کے نظریہ کا سیاسی اظہار عالمگیر اسلامی خلافت کے بجائے مسلم اقوام کی ایک جماعت کی شکل میں زیادہ بہتر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ کلکتہ میں اُن کے قیام کے دوران بہت سے مسلم علماء اور دانشور اُن کے اسلامی اتحاد کے نظریہ سے کافی متاثر ہوئے۔ نواب عبد اللطیف اور سید امیر علی نے بھی اُن سے ملاقات کی اور اُن کی فکر اور شخصیت سے متاثر ہوئے۔

ایک اور عنصر جو سید احمد خان کے سیاسی رجحان کی وضاحت کرتا ہے وہ سماجی ڈھانچے اور طبقاتی حیثیت کے بارے میں ان کا رویہ ہے۔ سید احمد خان نے خود اشرافیہ کا ایک رُکن ہوتے ہوئے سماجی مقام اور حیثیت کو بہت اہمیت دی۔ اُن کے نزدیک کسی قوم اور برادری کی اصل طاقت عوام الناس کے بجائے اس کی شرافت اور اشرافیہ میں پنہاں ہوتی ہے۔ جمہوریت کے بارے میں ان کے شکوک و شبہات کے پیچھے جزوی وجہ یہی تھی جس میں ایک عام آدمی کا ووٹ اشرافیہ کے رُکن کے ووٹ کے برابر تصور ہوتا ہے۔ سید احمد خان کے نظریہ کا تضاد یہ ہے کہ وہ یورپ کے سماجی اور فکری انقلاب کو قبول کرنے کے باوجود سیاسی جدیدیت کے ایک اہم پہلو کو مسترد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن شاید سید احمد خان کے خیال میں ہندوستان ابھی جمہوریت کے لیے تیار نہیں تھا یا شاید جمہوریت ہندوستانی سیاسی ماحول کے لیے ساز گار نہ تھی۔ ہندو تعداد میں ہمیشہ مسلمانوں سے زیادہ ہوں گے اور اس طرح جمہوری نظام میں مسلمان ہمیشہ پسماندہ رہیں گے۔ 1866ء میں سید احمد خان نے برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی جس کے زیادہ تر اراکین کا تعلق زمیندار اشرافیہ سے تھا۔

سید احمد خان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے مسلمان اور ہندو دونوں نے کوششیں کی ہیں۔ اگرچہ ان کے مذاہب مختلف ہیں لیکن اُن کی زبان، ثقافت اور خطہ ایک ہی ہے۔ اب انگریزوں نے اپنا راج قائم کرنے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ تینوں برادریوں کو ہندوستان کی ترقی کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے۔ ہندوستانیوں کو برطانوی راج کا وفادار ہونا چاہئے کیونکہ انھوں نے ہندوستان میں نظم و ضبط اور امن قائم کیا ہے اور ہندوستانیوں کو انگریزوں سے جدید علمی نظام سے متعلق اگاہی حاصل کرنی چاہیے۔ چونکہ مسلمانوں کو خاص طور پر انگریز باغی سمجھتے تھے، اس لیے سید احمد خان نے اس نظریہ کو بدلنے کی تمام تر کوششیں کیں۔ 1860ء میں شائع ہونے والی اپنی تصنیف 'رسالہ خیر خواہان مسلمانان' میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو برطانوی راج کی سب سے وفادار رعایا قرار دیا۔ انھوں نے اسلام اور مسیحیت کے درمیان مشترکات کو واضح کیا۔ تاہم سید احمد خان کے بقول عملاً

انگریز اور ہندوستانی مسلمان دونوں اِن مشترک اقدار کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں اور ان کے باہمی شکوک و شبہات، تعصب اور بے خبری ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ اپنی کتاب 'احکامِ طعامِ اہلِ کتاب' میں انھوں نے مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان سماجی رابطوں کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ سید احمد خان شاید پہلے مسلمان تھے جنھوں نے بائبل کی تفسیر لکھی۔ انھوں نے اس تفسیر کے ضمیمہ (تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام) میں مکہ کے فقیہہ جمال ابن العبد اللہ عمر الحنفی کا فتویٰ بھی شامل کیا ہے۔ اس فتویٰ کے مطابق ہندوستان اس وقت تک دارالاسلام ہے جب تک اس میں اسلامی رسومات برقرار رہیں۔ سید احمد خان نے مزید یہ بھی بیان کیا کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی ملک میں رہتے ہیں اور لحاظ سے وہ ایک قوم ہیں[9]۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے 1883ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے موقع پر پٹنہ میں اپنی تقریر میں واضح الفاظ میں کیا تھا:

دوستو، جس طرح اعلیٰ ذات کے ہندو کبھی اس سرزمین میں آکر آباد ہوئے اور اپنے آبائی گھروں اور علاقوں کو بھول کر ہندوستان کو اپنا ملک سمجھنے لگے، ہم نے بھی بالکل ایسا ہی کیا ہے۔ ہم نے بھی سینکڑوں سال پہلے اپنے مال و جائیداد کو چھوڑ دیا اور ہندوستان کی سرزمین کو اپنا سمجھا... میرے ہندو بھائی اور میرے ہم مذہب مسلمان دونوں ایک ہی ہوا میں سانس لیتے ہیں، مقدس گنگا اور جمنا کا پانی پیتے ہیں، وہ چیزیں کھاتے ہیں جو خدا نے اس ملک کو دی ہیں۔ ہمارا مرنا اور جینا اکٹھا ہے... میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ روزمرہ کی زندگی کے تمام معاملات میں، ہندو اور مسلمان واقعی ایک برادری سے تعلق رکھتے ہیں... اگر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی سے رہیں تو یہ ہندوستان نامی دلہن ہمیشہ درخشاں اور خوبصورت رہے گی[10]۔

اگرچہ لالہ لاجپت رائے جیسے آریہ سماج کے کچھ ارکان سید احمد خان کی انگریز نواز پالیسی کی وجہ سے ان کے مخالف تھے، لیکن بہت سے ہندوؤں نے سید احمد خان کے مقصد کی حمایت بھی کی۔ سید احمد خان نے خود علی گڑھ کالج کو مسلم برادری میں علیحدگی کا شعور پیدا کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا۔ علی گڑھ کالج میں تمام مذاہب کے طلباء کو یکساں مواقع میسر تھے اور علی گڑھ کالج سے گریجویشن کرنے والا پہلا طالب علم ایک ہندو تھا[11]۔ اگرچہ اپنے تعلیمی منصوبے کا آغاز کرتے وقت سید احمد خان کے ذہن میں مسلم برادری کی ضروریات مقدم تھیں، لیکن پھر بھی ان کا نقطہ نظر فرقہ وارانہ نہیں تھا[12]۔

سید احمد خان مذہب اور سیاست کو الگ رکھنے کے حامی تھے۔ اُن کے مطابق دنیاوی معاملات روحانیت اور مذہبیت سے نہیں چلتے۔ 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کے فوراً بعد سید احمد خان نے عوامی

تقریروں اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اپنی تحریروں کے ذریعے اُس کی مخالفت شروع کر دی۔ کئی ایک عوامل نے کانگریس کے بارے میں اُن کے رویے کا تعین کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے محسوس کیا کہ کانگریس کی اشتعال انگیز سیاست ہندوستانیوں کو انگریزوں کے ساتھ تصادم کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے جس کے نتیجے میں ایک اور بغاوت سر اُٹھا سکتی ہے جو ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہو گی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، 1857ء کی بغاوت اور بالخصوص مسلم برادری کے جان و مال کے نقصان کے حوالے سے اس کے مابعد نتائج نے سید احمد خان کے نقطہ نظر کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا سارا منصوبہ دراصل بالعموم ہندوستانیوں کو اور بالخصوص مسلم برادری کو بچانے کی ایک کوشش تھی۔ اس لیے کوئی بھی راستہ جس میں تصادم کا ذرا سا بھی عنصر موجود ہو تا اُن کے لیے نا قابل قبول تھا۔ دوم، اُن کا خیال تھا کہ سیاسی معاملات میں ملوث ہونے سے ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ تیسرا یہ کہ اُن کا اشرافیائی سوچ کا حامل ذہن ایک ایسا پلیٹ فارم بنانے کی منطق کو سمجھنے اور تسلیم کرنے سے قاصر تھا جس میں سماج کے نچلے طبقے سمیت مختلف سماجی پس منظر کے لوگ سیاسی عمل کے لیے اکٹھے کام کر سکیں۔ اُنھوں نے حقیقی طور پر محسوس کیا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کو تعلیم حاصل کرنی چاہیے اور عوام کو قیادت فراہم کرنی چاہیے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سید احمد خان نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کو بھی انڈین نیشنل کانگریس میں شامل نہ ہونے کی نصیحت کی اور یہ باور کرایا کہ بالخصوص مسلمان سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہونے سے شکست سے دوچار ہو جائیں گے۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلمان 1857ء میں پہلے ہی مشکلات کا شکار ہو چکے ہیں اور اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان تعلیم پر توجہ دیں۔ بدرالدین طیب جی کے نام ایک خط میں انھوں نے تحریر کیا کہ "یہ مناسب نہیں ہے کہ مسلمان کانگریس کی طرح کی کارروائیوں میں حصہ لیں جو مختلف جگہوں پر اجلاس منعقد کرتی ہے جس میں لوگ عوام کے ہجوم کے سامنے حکومت پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنی رعایا کے حقوق غصب کر رہی ہے۔[13]"

انڈین نیشنل کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے سید احمد خان نے یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی جس کا بنیادی مقصد ہندوستانی اشرافیہ کو برطانوی پارلیمنٹ سے جوڑنا تھا۔ سید احمد خان کو اپنے منصوبہ کی کامیابی کے لیے برطانوی تعاون کی ضرورت تھی اور کئی بار علی گڑھ کالج کے برطانوی پرنسپل علی گڑھ کی مقامی انتظامیہ اور برطانوی حکومتی حلقوں کے درمیان رابطے کا کام سر انجام دے چکے تھے۔ تھیوڈور بیک جنھوں نے 1884ء میں علی گڑھ کالج

کے پرنسپل کی حیثیت سے اپنا چارج سنبھالا، سید احمد خان پر خاصے اثر و رسوخ کے حامل تھے[14]۔ بیک(Beck) کو سیاست میں بہت دلچسپی تھی[15]۔ اُن کا رجحان انگلستان کی سیاسی پارٹی ٹوری(Tory) کی طرف تھا۔ انھوں نے گلیڈ اسٹون کی آزاد خیالی کی مخالفت کرتے ہوئے حکومت مخالف کانگریس کا مقابلہ کرنے کو اپنا مشن بنایا جسے وہ ہندوستان کے امن کے لیے بُرا سمجھتے تھے[16]۔ سید احمد خان کی سیاسی پالیسی حقیقت پسندی کے احساس پر مبنی تھی۔

کانگریس کے بارے میں سید احمد خان کے نقطہ ہائے نظر سے ہر مسلمان رہنما متفق نہیں تھا[17]۔ مولانا محمد علی جوہر نے جو خود علی گڑھ کے گریجویٹ تھے، کہا کہ اس زمانے میں سید احمد خان کے زیرِ اثر مسلمانوں کی سیاست صرف کانگریس کے خلاف قرارداد پاس کرنے اور اسے 'پائنیر' یا 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' میں شائع کرنے تک محدود تھی[18]۔ سید احمد خان کے سیاسی نقطہ ہائے نظر زیادہ تر علی گڑھ اور کانگریس کی مخالفت کے لیے تشکیل کردہ یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اور محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن جیسے اداروں تک محدود تھے۔ نو آبادیاتی مخالف رویہ رکھنے والے ایک سو سے زائد علمانے جن میں مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمود حسن شامل ہیں، نصرت الابرار کے نام سے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی مخالفت اور کانگریس کی حمایت کرنے کا فتویٰ جاری کیا[19]۔ اس فتویٰ نے دیوبند کے مستقبل کے علماء کی سیاسی جدوجہد کی بنیاد رکھی۔ علی گڑھ کے کئی اہم گریجویٹس سید احمد خان سے متفق نہ تھے اور وہ کانگریس کے ساتھ قومی سیاست میں شامل ہو گئے۔ ان گریجویٹس میں سب سے اہم نام محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی، اور ظفر علی خان ہیں۔ ان سب نے تحریک خلافت اور ہندوستان کی قومی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔

بدرالدین طیب جی(1844-1906)[20]، بمبئی کی سلیمانی بوہرہ برادری سے تعلق رکھنے والے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے لندن بار میں امتحان پاس کیا اور پہلے مسلمان ایڈووکیٹ بنے اور بعد میں بمبئی ہائی کورٹ کے جج تعینات ہوئے۔ طیب جی کا خیال تھا کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل پر بات چیت کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں کو نیشنل کانگریس میں شامل ہونا چاہیے اور اگر مسلمان کسی بات کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں تو انھیں کانگریس کے اندر رہتے ہوئے کرنی چاہیے۔ سید احمد خان کا کانگریس پر بنیادی اعتراض اس کا 'سیاسی' ہونا اور نمائندہ اداروں کا مطالبہ کرنا تھا۔ سید احمد خان کے مطابق ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان سیاست میں حصہ لینے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اُن کو خدشہ تھا کہ سیاسی مطالبات اشتعال انگیز سیاسی مظاہروں اور پھر کھلم کھلا بغاوت کی صورت اختیار کر جائیں گے۔ سید احمد خان سماجی اور تعلیمی پہلوؤں پر توجہ مرکوز رکھنا چاہتے تھے[21]۔

مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں سید احمد خان کے نقطہ ہائے نظر اکثریت پسندی سے متعلق

ان کی سوچ پر مبنی تھے۔ اس طرح انھوں نے انڈین کونسلوں کے آئین میں انتخاب کے اصول کو متعارف کرانے کی مخالفت کی جس کا مطالبہ انڈین نیشنل کانگریس نے کیا تھا۔ سید احمد خان کی رائے میں کسی بھی معاشرے کا سیاسی نظام اُس معاشرے کے سماجی آئین پر مبنی ہوتا ہے۔ انگلستان میں لوگ بڑی حد تک آزاد ہیں جو امیدواروں کا عقلی طور پر انتخاب کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستانی معاشرہ آزاد افراد کا معاشرہ نہیں ہے بلکہ ثقافت، مذہب اور ذات پات پر مبنی بڑے سماجی گروہوں پر مشتمل ہے۔ اور چونکہ یہ گروہ نہ تو اپنے حجم میں برابر ہیں اور نہ ہی اپنے انسانی اور مادی وسائل میں، اس لیے جمہوری اصول کے سادہ اور نامکمل اطلاق سے اکثریت کی حکمرانی اور اقلیتی گروہوں کی پسماندگی میں اضافہ ہوگا۔

بعد ازاں مولانا ابوالکلام آزاد نے 1949ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کانووکیشن سے خطاب کرتے ہوئے سید احمد خان کی انڈین نیشنل کانگریس سے متعلق پالیسی کو اُن کی بڑی غلطی قرار دیا[22]۔ خلیق احمد نظامی کے مطابق سید احمد خان کا خیال تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی صرف تعلیم پر توجہ دینی چاہیے اور یہ سیاسی مظاہروں کا وقت نہیں ہے[23]۔ سید احمد خان کی رائے میں ہندوستان میں مسلم برادری کو اپنے ہندو ہم منصبوں کے مقابلے تعلیمی اور ثقافتی ترقی کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ہندوؤں نے بہت پہلے مغربی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔ لیکن جب سید احمد خان نے مسلم برادری کو مغربی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی تو اس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں میں علیحدگی کا شعور یا الگ سیاسی شناخت پیدا کرنا نہیں تھا۔ انھوں نے ان ہندوؤں کی تعریف کی جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان کا دورہ کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی وفات سے ٹھیک ایک سال قبل لکھا کہ "بلاشبہ، جس طرح میں مذہبی تفریق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دو برادریوں (ہندوؤں اور مسلمانوں) کے درمیان دوستی، اتحاد اور محبت کے فروغ کا خواہاں ہوں اسی طرح میں سماجی طور پر سیاسی اختلافات کے باوجود باہمی تعاون، محبت، ہمدردی اور بھائی چارے کی فضا دیکھنا چاہتا ہوں[24]۔"

سید احمد خان نے 'قوم' کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ انھوں نے یہ لفظ لوگوں کے کسی بھی ایسے گروہ کے لیے استعمال کیا ہے جس میں کچھ نہ کچھ مشترک ہے۔ انھوں نے مسلم برادری کو 'قوم' کہا ہے اور تمام ہندوستانیوں کو بھی 'قوم' کا نام دیا ہے۔ درحقیقت دو قومی نظریہ کا وجود سید احمد خان کی تصانیف میں بمشکل ہی نظر آتا ہے۔ انھوں ہندوستان کے تمام لوگوں کو اُن کی مخصوص خصوصیات کے باوجود 'قوم' کے ارکان کے طور پر ہی بیان کیا۔ سید احمد خان نے واضح طور پر تحریر کیا ہے کہ "قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں ہیں[25]۔"

اردو-ہندی تنازعہ[26] نے ہندو اور مسلم برادریوں میں الگ الگ شعور پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ شمالی

ہندوستان میں سرکاری زبان فارسی تھی لیکن 1837ء میں اس کی جگہ اردو نے لے لی۔ شمالی ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی اردو میں مہارت رکھتے تھے۔ ہندی اور اردو کھڑی بولی پر مبنی ہیں اور ایک ہی صرفی و نحوی ساخت کی حامل ہیں۔ البتہ ان دونوں زبانوں میں لغت کا فرق ہے کیونکہ اردو میں عربی اور فارسی جبکہ ہندی میں سنسکرت کے ذخیرہ الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے[27]۔ اس کے علاوہ کچھ آوازوں کے حوالے سے بھی یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے قدرے مختلف تھیں۔ مثال کے طور پر ہندی میں "زا" کی آواز نہیں ہے۔ اس آواز کو عام طور پر "جا" سے بدل دیا جاتا ہے۔ بنیادی فرق ان کے رسم الخط میں ہے۔ اردو اور ہندی کے رسم الخط دو بالکل مختلف نظاموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو کے رسم الخط کی جڑیں عربی کے حروف تہجی میں پیوست ہیں جو اسلام کی مقدس زبان ہے جبکہ ہندی (دیوناگری[28]) کا رسم الخط ہندو مذاہب کی مقدس زبان سنسکرت کے حروف پر مبنی ہے۔ عربی رسم الخط کے ساتھ اردو زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ایک طویل عرصے تک ایک مشترکہ زبان کے طور پر استعمال کیا تھا۔ درحقیقت یہ ہندو-مسلم تہذیب کا ثمر تھی۔ 1860ء تک اردو کی شناخت صرف مسلمانوں سے منسوب نہ تھی لیکن جب اردو کو ہندی سے بدلنے کے لیے ہندی کی تحریک کا آغاز ہوا تو فرقہ وارانہ شعور کے بیج بوئے گئے۔ سید احمد خان اردو-ہندی تنازعہ سے بے حد پریشان تھے۔ اُن کے مطابق اردو ہندوستان میں مختلف ثقافتی گروہوں کے اتحاد اور انضمام کی علامت تھی۔ اردو کے لیے ان کی حمایت اس لیے نہیں تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے۔ 1860ء سے 1890ء تک شمال مغربی صوبوں کے بہت سے ہندوؤں نے ہندی کے نفاذ کے لیے منظم تحریک شروع کی جس کے سبب اردو کو ہندی سے 'الگ' زبان کے طور پر پیش کیا جانے لگا اور اردو کو مسلم ثقافت کی علامت بنا دیا گیا۔ مسلمانوں نے اردو کا دفاع شروع کیا جس کے نتیجہ میں الگ شناخت کا شعور پیدا ہوا[29]۔ متحدہ صوبہ جات میں برطانوی زبان کی پالیسی نے بھی اردو-ہندی تنازعہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں سکولوں میں ہندی پڑھائی جاتی تھی جبکہ اردو انتظامیہ کی زبان تھی[30]۔ سید احمد خان کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ ہندی تحریک کا سارا طرزِ عمل اور زبان کی برطانوی پالیسی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج پیدا کر رہی ہے[31]۔

سید احمد خان کی تحریروں اور تقریروں سے بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ تنگ نظر نظریہ ساز نہیں تھے جو مسلم برادری میں علیحدگی پسندی کے بیج بو رہے تھے۔ کانگریس سے اُن کی مخالفت اور اردو کے لیے اُن کی حمایت ہندوؤں سے کسی قسم کی دشمنی کی وجہ سے نہ تھی۔ خواہ یہ صحیح تھا یا غلط، انھوں نے کانگریس کی سیاست کو ہندوستان کی سماجی اور تعلیمی ترقی کے لیے نقصان دہ تصور کیا اور اردو کی حمایت کی کیونکہ اردو ہندو-مسلم تہذیب کی علامت تھی۔ انھوں نے پین اسلام ازم کی مخالفت کی اور ہندوستانی مسلمانوں پر خلافتِ عثمانیہ کے خلیفہ کے دعووں کو مسترد کرتے

ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کو صرف ہندوستانی تناظر میں رہنے اور ترقی کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے اپنی وفات سے صرف ایک ہفتہ قبل لکھا تھا کہ "ہم میں یہ تسلیم کرنے کی ہمت ہونی چاہیے کہ جو تعلیم ہمارے ہندو نوجوانوں کو مسلمانوں سے نفرت کرنا سکھا رہی ہے وہ ایک دن انھیں یہ ضرور سمجھائے گی کہ جب تک ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں ہوتے اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا نہیں سیکھتے، انگریزوں کے دور حکومت میں ان میں سے کسی کو بھی عزت و احترام حاصل نہیں ہو گا"[32]۔

غرض یہ کہ 1857ء میں جنگِ آزادی کی ناکامی ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا۔ اس ناکامی نے کئی طرح کے ردِ عمل کو جنم دیا۔ ان میں علی گڑھ اور دیوبند سرفہرست ہیں۔ دونوں نے تعلیم کو کلیدی مسئلہ قرار دیا۔ دیوبند کے علماء نے کلاسیکی اسلامی روایت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جبکہ سید احمد خان نے اسلامی جدیدیت کا منصوبہ شروع کیا۔ سید احمد خان کے سیاسی رجحان کے پانچ پہلو قابلِ ذکر ہیں۔ اول، وہ پین اسلام ازم کے سخت ترین ناقدین میں سے ایک کے طور پر ابھرے۔ دوم، وہ انگریزوں کے ساتھ محاذ آرائی پر مبنی کسی بھی سیاسی سرگرمی کے خلاف تھے۔ سوم، اُن کا خیال تھا کہ جدید ریاست فطری طور پر سیکولر ہے۔ چہارم، اُن کی رائے میں جمہوریت اگرچہ انگلستان میں ایک اچھا نظامِ حکمرانی تھا لیکن ہندوستان کے لیے موزوں نہ تھا کیونکہ ہندوستان ثقافتوں، مذاہب اور زبانوں کے تنوع سے لبریز ہے۔ پنجم، یہ کہ انھوں نے ہمیشہ کہا کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے ہندو۔ مسلم اتحاد ضروری ہے۔

مصادر و مراجع

1 حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید، نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، 1912ء۔

2 پانی پتی، مولانا محمد اسمٰعیل، مقالات سرسید، جلد سوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1992ء۔

3 سرسید احمد خان کی ذاتی اور فکری سوانح عمری کے لیے، ملاحظہ کریں، الطاف حسین حالی، 'حیات جاوید' (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1982)۔ اس کتاب کو ڈیوڈ جے میتھیوز نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے (نئی دہلی: روپا اینڈ کمپنی، 1994)۔ سرسید کی زندگی میں انگریزی میں لکھی گئی ابتدائی سوانح عمریوں میں سے ایک کے لیے، ملاحظہ کریں:

G.F.I. Graham, *The Life and Work of Sayyid Ahmad Khan* (Delhi: Idara-e Adabiyat-e Dilli, 1974 originally published in 1885). Available online: https://archive.org/details/lifeworkofSayyidah00grah/page/n6/mode/2up (Accessed on 28th February 2020.)

4 تاہم بعض مؤرخین نے جنگِ آزادی میں علماء کے کردار کو کم اہمیت دی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کریں:

Iqtidar Alam Khan 'The Wahhabis in the 1857 Revolt; A Brief Reappraisal of Their Role', Social Scientist 41, no 5/6 (2013); 15-23.

5 Smith, Wilfred Cantwell. *Modern Islam in India.* Lahore: Minerwa, 1945.

6 پانی پتی، مولانا محمد اسمٰعیل، مقالات سر سید، جلد13، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۳ء۔

7 فارسی (بمبئی 1881ء)، اردو(کلکتہ 1883ء)، عربی (بیروت 1886ء) میں شائع ہوا۔

8 Hourani, Albert. *Arabic Thought in the Liberal Age, 1798-1939.* Cambridge: Cambridge University Press, 1983.

9 Sherwani, Haroon Khan. "The Political Thought of Sir Syed Ahmed Khan ." *The Indian Journal of Political Science,* 1944: 306-328.

10 Quoted in Yasmin Saikia, "Sir Sayyid on History" in Yasmin Saikia, M. Raisur Rahman (Eds) *The Cambridge Companion to Sayyid Ahmad Khan.* Cambridge: Cambridge University Press, 2019. P.35.

11 اِشوری پرساد جو بعد میں ایک مشہور مؤرخ بنا۔

12 Nizami, Khaliq Ahmad. *Sayyid Ahmad Khan.* Delhi: Publications Division Government of India, 1966.

13 Quoted in Shan Muhammad (ed.), *Writings and Speeches of Sir Sayyid Ahmad Khan* (Bombay: Nichiketa Publications Limited, 1972), p.240.

14 Hasan, Mushirul. *Nationalism and Communal Politics in India, 1885-1930.* New Delhi: Manohar Publications, 1991.

15 ایضاً

16 ایضاً

17 مسلمانوں کی طرف سے سر سید کے سیاسی نظریات پر تنقید کے لیے ملاحظہ کریں:

Prem Narain, *Press and Politics in India, 1885-1905* (Delhi: Munshiram Manoharlal Publishers 1970); and A. M. Zaidi (ed), *The Muslim School of Congress: The Political Ideas of Muslim Congress Leaders from Mr. Badaruddin Tayyabji to Maulana Abul Kalam Azad 1885-1947.* New Delhi: Publication Department, Indian Institute of Applied Political Research, 1987.

18 Hasan, Mushirul. *Nationalism and Communal Politics in India, 1885-1930.* New Delhi: Manohar Publications, 1991.

19 Qureshi, Ishtiaq Husain. *Ulema in Politics.* Second. Karachi: Ma'aref Limited, 1974.

20 طیب جی کی زندگی اور تصانیف کے لیے ملاحظہ کریں:

Badr-ud-din Tayyabji, *Memoirs of an Egoist.* Delhi, 1988. And A.G. Noorani, *Badruddin Tyabji.* Delhi, 1969.

21 کانگریس کے حق میں طیب جی کے مختصر دلائل اور سید احمد خان کے جواب کو پائنیر کے ایڈیٹر کے نام ان کے خطوط میں دیکھا جاسکتا ہے، جو درج ذیل لنک پر آن لائن دستیاب ہیں:

http://www.columbia.edu/itc/mealac/pritchett/00islamlinks/txt_sir_sayyid_tyabji_1888.html (Accessed on 6th March 2020.)

22 Azad, Abul Kalam. *Selected Speeches and Writings.* Delhi: Ministry of Information and Broadcasting, Governement of India, 1989.

23 Nizami, Khaliq Ahmad. *Sayyid Ahmad Khan.* Delhi: Publications Division Government of India, 1966.

24 ایضاً

25 سید اقبال علی، 'سید احمد خان کا سفر نامہ پنجاب'۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، 1991۔ صفحہ 154۔

26 اردو– ہندی مسئلے پر بحث کے لیے، ملاحظہ کریں: Christopher R. King, *One Language, and Two Scripts: The Hindi Movement in Nineteenth Century North India.* New Delhi: Oxford University Press, 1994; Daud Rahbar, "Gandhi and the Hindi-Urdu Question" in Harold Coward (ed.) *Indian Critiques of Gandhi.* Albany: Sunny Press, 2003. p. 217-238; گیان چند جین، 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005؛ پروفیسر فتح محمد ملک (ایڈیشن)، 'اردو زبان اور اردو رسم الخط'۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، 2008۔

27 King, Christopher R. *One Language Two Scripts: The Hindi Movement in Nineteenth Century North India.* New Delhi: Oxford Univeristy Press, 1994.

28 دیوناگری کا لفظی مطلب ہے دیوتاؤں کا شہر یا فرشتوں کا شہر۔

29 Brass, Paul R. "Muslim Separatism in United Provinces: Social Context and Political Strategy Before Partition." *Economic and Political Weekly,* January 1970: 167-9.

30 King, Christopher R. *One Language Two Scripts: The Hindi Movement in Nineteenth Century North India.* New Delhi: Oxford Univeristy Press, 1994.

31 Beg, Mirza Asmer. "Understanding Sir Sayyid's Political Thought." In *The Cambridgr Companion to Sayyid Ahmad Khan,* by M. Raisur Rahman Yasmin Saikia, 175-94. Cambridge: Cambridge Univeristy Press, 2019.

32 علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 19 مارچ 1898، علی گڑھ۔